شیخ قلندر بخش جرأت

مراثیٔ جرأت

مُرتّبہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی

اردو دنیا ۔ کراچی

سلسلۂ مطبوعاتِ اُردو دُنیا، نمبر ۵

مراثیِ جرأت

جُرأت کے غیر مطبوعہ مرثیے اور سلام

مرتّبہ
ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایم اے، پی ایچ ڈی۔
اُستادِ شعبۂ اُردو و ثقافتِ پاکستان
اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
یُونیورسٹی آف لندن

شائع کردہ
اُردو دُنیا
کراچی ——— لاہور

مراثیٔ جرأت

تصنیف : شیخ قلندر بخش جرأت دہلوی

ترتیب : ڈاکٹر عبادت بریلوی

مقدمہ : ڈاکٹر عبادت بریلوی

کتابت : سید فضل شاہ

طباعت : اشرف پریس لاہور

نشر و اشاعت : اردو دنیا، کراچی : لاہور

تاریخ اشاعت : ۱۹۷۴ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : 100/-

سعادت یار خاں نے اشرف پریس لاہور میں چھپوایا اور اردو دنیا کراچی
سے شائع کیا

فہرست

مقدمہ : ڈاکٹر عبادت بریلوی

مراثی

سلام

مُقدّمہ

جُرأت اپنے زمانے کے باکمال شاعر تھے۔ اُنھوں نے اُردُو شاعری میں ایک مخصُوص رنگ نکالا۔ اُس کو ایک نئے طرز سے آشنا کیا۔ اُس میں نئے انداز کے چراغ جلائے۔ نئی رنگ کی شمعیں فروزاں کیں۔ وُہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے بہ ذاتِ خود ایک دُنیا تھے۔ اس لیے اُنھوں نے شاعری میں بھی ایک نئی دُنیا پیدا کی —— یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ اُن کی شاعری کے ساتھ ذہنی مطابقت پیدا نہ کر سکے۔ میرؔ صاحب نے اُن کی شاعری کو "چُوما چاٹی" سے تعبیر کر کے اور شیفتہؔ نے اُن کے نغموں کو "خارج از آہنگ" کہ کر شاعری اور تنقید دونوں پر بڑا ستم کیا ہے —— اس سے بھی بڑا ستم آزادؔ نے کیا کہ بعض واقعات کو نقل کر کے اِس قسم کے خیالات کو تقویت پہنچائی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جُرأت کو ایک معاملہ بند اور فحش گو شاعر تصوّر کر لیا گیا اور ہمارے نقّاد تک صرف اِسی لکیر کو پیٹتے رہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی شاعری میں جو زِندگی اور جولانی، جو شگفتگی اور شادابی، جو بانکپن اور طرحداری ہے، وُہ اُردُو شاعری میں کہیں اور ذرا مشکل ہی سے مِل

سکتی ہے۔ میر حسن نے "بسیار دردمند و گدازانہ" کہہ کر اُن کے کلام کی داد دی ہے لیکن یہ اُن کا خاص رنگ نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے دیوان میں خاصی تعداد ایسے اشعار کی ملتی ہے جن میں درد و غم کا بیان ہے لیکن اُن میں دردمندی اور گداز کی خصوصیات ناپید ہیں۔ اُن کے ایسے اشعار جذبے سے خالی ہیں۔ اُن میں اخلاص مندی اور صداقت کا لہو نہیں ہے۔ اِسی لیے وُہ بے جان نظر آتے ہیں۔ اُن کے اشعار ہیں تو زندگی کا احساس وہاں ہوتا ہے جہاں وُہ انسانی زندگی کے حسین ترین لمحوں کی لطیف ترین کیفیات کی مصوّری کر کے رنگ و نُور کے دریا بہاتے ہیں۔

شیخ قلندر بخش جُرأت دِلّی کے رہنے والے تھے۔ اُن کا نام یحییٰ امان تھا۔ اُن کے والد حافظ امان کے نام سے مشہور تھے۔ خاندان کا سلسلہ رائے امان سے ملتا ہے جو عہدِ محمّد شاہی میں دربان تھے۔ جب نادر شاہ نے دِلّی پر حملہ کیا تو رائے امان بھی گرفتار ہُوئے، اور نادر شاہ کے جلّادوں نے اُنھیں قتل کر دیا۔ دِلّی کے چاندنی چوک میں رائے امان کا کُوچہ مشہُور ہے۔ یہ اُنھیں کے نام پر ہے۔ جُرأت اِسی رائے امان کے کُوچے میں پیدا ہُوئے۔ اُن کی تاریخ ولادت کا صحیح علم نہیں۔ تمام تذکرہ نگار اس باب میں خاموش ہیں۔ اُن کے ہم عصروں تک نے اِس سِلسلے میں کچھ نہیں لکھا۔

مُصحفی نے صرف اتنا لکھا ہے۔

"جُرأت تخلّص یحییٰ امان است۔ قلندر بخش نام دارد۔ یحییٰ امان نام آبائی اوست۔ بدیں جہت کہ خود را از اولادِ بچے رائے امان می گوید۔ اُو شخصے گزشتہ کہ ہنوز در محلہ کہ مُتّصل چاندنی چوک جائے بُود و باش اُو بُود بہ کوچہ رائے امان شہرت دارد۔ مُشارٌ الیہ از انقلاب زمانہ مع عشائر در

صغر سن بہ پورب رسیدہ وہم ایں جا نشو و نما یافتہ و جوان گردیدہ۔ از ابتدائے موزونیٔ طبع مشقِ ریختہ پیشِ میاں جعفر علی حسرت کردہ کلامِ خود را بہ پایۂ پختگی رسانیدہ۔ چنانچہ الحال بقولِ جمہور از اُستادِ خویش پایۂ کمی نمی آرد۔ و در شعر خود تلاش ماتمیانہ بسیار می کند۔ و پاس تمام از کلامش تراود و مزاجش بہ طرف مسلسل گوئی و غزل در غزل گفتن بیشتر مائل است۔ شاگردان بسیار بہم رسانیدہ و معہذا در علمِ نجوم ہندیاں و ستار نوازی نیز مہارتے دارد حیف کہ چشمش در عینِ جوانی بہ یک ناگاہ نابینا شد۔"[1]

اور میر حسن نے صرف اتنی تفصیل پیش کی ہے:

"میاں قلندر بخش المتخلص بہ جرأت از شاگردان میاں حسرت۔ جوانے ست بیچک رو، خوش خلق و نیک خو، کلامش نمکین و بیانش شیریں دستگاہِ شعورش چوں دلِ صاحب ہمتاں فراخ و گلزارِ معانیش چوں میوۂ آرزو شاخ در شاخ۔ اصل از شاہجہان آباد، نشو و نما در فیض آباد یافتہ شوقِ شعر از حد زیاد دارد۔ اگرچہ در علمِ موسیقی و ستار نوازی نیز دستے بہم رسانیدہ لیکن آنچہ گویند دیوانۂ فنِ شعر ست کہ گاہے بے فکر نمی ماند۔ بسیار دردمند و گداز است۔ مثنوی ہجو برسات و کھٹمل نامہ ہم گفتہ۔ دریں نوجوانی بسیار بہ حلم و حیا بسر می برد۔ خدا اُش سلامت دارد۔"[2]

اور قدرت اللہ قاسم نے مجموعۂ نغز میں لکھا ہے:

"عزیزے است شیریں کلام قلندر بخش نام لطفِ طبعش از اشعارِ آبدارش

---

[1] مصحفی: تذکرۂ ہندی، ص ۶۲، ۶۳ [2] میر حسن: تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۵۴

پیداست و مہارتِ وے دریں فن از کثرتِ مشقش ہویدا۔ در نجوم و موسیقی اندکے دست دارد و سِتار خوب می نوازد۔ نیاگانش بہ دربانیٔ دربارِ دُربار سرِ افتخار بہ آسماں می سُودند۔ اصلش از حضرتِ دہلی است۔ اگرچہ از چندے بہ لکھنؤ رختِ اقامت افگندہ۔ افسوس کہ در عینِ عنفوانِ شباب چشمِ جہاں بینش از نورِ بینائی بے آب گشتہ۔ مشقِ سخن در ابتدا از میاں جعفر علی حسرتؔ نمودہ و بنا بر کثرتِ توغُّل و مناسبتِ طبع رفتہ رفتہ گوئے سبقت از شعرائے دیارِ مشرق ربودہ و بہ سبب سیرِ مشقی حسبِ رواجِ آں دیار آنچناں اشعارِ ابدار از طبعِ گوہر بارش تراوش می کند کہ مقدورِ فصحائے آں جا نیست و جمِّ غفیرے از سکنۂ لکھنؤ نسبتِ تلمُّذ بہ وے دارند و گروہے کثیر وے را دریں فنِ شریف بے مثل و عدیل پندارند۔“[۵]

اور شیفتہؔ نے ”گلشنِ بے خار“ میں اُن کے حالات کی صرف اتنی وضاحت کی ہے :

”جرأت تخلّص قلندر بخش نام، سلسلۂ نسبش بہ رائے مان محمّد شاہی کہ بہ دستِ جلّادانِ نادری گرفتار آمد و مردانہ جاں داد، می رسد۔ در عملِ موسیقی لافِ نکتہ دانی میزد و می رسیدش۔ ستار نیکو نواختے و لختے از احکامِ سیرِ انجم نیز شناختے۔ نیک و بدِ زمانہ کمتر دیدہ چشم از نظارہ بربست۔ رُوئے نیکواں بہ حسرت نتوانست دید۔ بہ صحبتِ مہ لقایاں و نغمہ سرایاں سرے داشت۔ روزگارے از خوانِ نوالِ مرزا سلیمان شکوہ بہادر کامیاب و بہرہ مند بود۔ آں جا بہ انشاؔ و مصحفیؔ مطارحہ کردے و بیک

---

۵ میر قدرت اللّٰہ قاسم : مجموعۂ نغز، ص۱۵۵

ردیف و قوافی سخن گفتہ ۔ امروز مُردنش را زیادہ از بیست سال گزشتہ ۔"[1]

اِن بیانات سے صرف اِتنا معلوم ہوتا ہے کہ جرأت دِلّی میں پیدا ہُوئے۔ لیکن وہاں کی پریشانیوں سے تنگ آ کر بچپن ہی میں پورب کی طرف چلے گئے۔ پہلے فیض آباد میں رہے پھر لکھنؤ میں قیام رہا اور یہیں جوان ہُوئے۔ شاعری کا شوق تھا۔ میاں جعفر علی حسرت کے شاگرد ہُوئے۔ فنِ شاعری کے علاوہ علمِ موسیقی خصوصاً ستار نوازی میں بھی کمال حاصل کیا۔ علمِ نجوم سے بھی دلچسپی لی اور اس میں بھی اُنھوں نے خاصی مہارت حاصل کی۔ ایک زمانے تک مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت میں رہے اور وہاں انشا اور مصحفی کے ساتھ مل کر شاعری کا ماحول پیدا کیا۔ عین عنفوانِ شباب میں نابینا ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود زندگی بھر دیوانۂ فنِ شعر رہے صحبتِ مہ لقایان و نغمہ سرایاں اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ اُنھی صحبتوں کے اسرار و رموز اور نشیب و فراز کو اُنھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے لیکن دردمندی اور گداز کی خصوصیات بھی اُن کی شاعری میں ملتی ہیں۔

بہرحال جرأت دِلّی میں پیدا ہُوئے۔ لیکن بچپن ہی میں وہاں سے فیض آباد گئے اور پھر لکھنؤ چلے گئے۔ اُن کی شخصیت اور شاعری کی نشو و نما اُنھی مقامات پر ہُوئی۔ شاعری کا شوق تھا۔ میاں جعفر علی حسرت کی شاگردی اختیار کی اور اِس فن میں بڑا نام پیدا کیا۔ اُن کے تمام ہم عصروں نے اُن کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ زندگی کا بیشتر حصّہ حافظ رحمت خاں کے بیٹے نواب محبت خاں اور مرزا سلیمان شکوہ کے درباروں میں گزارا۔ ۱۲۲۵ھ میں انتقال ہُوا۔ شیخ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

جب میاں جرأت کا باغِ دہر سے | گلشنِ فردوس کو جانا ہُوا
مصرعِ تاریخ ناسخ نے کہا | ہائے ہندوستان کا شاعر مُوا

---

[1] شیفتہ : گلشن بے خار : ص ۴۶

جراًت اپنے زمانے کی مشہور شاعرانہ شخصیت تھے۔ آزاد نے آبِ حیات میں اُن کی شخصیت کی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے ؎

"جراًت میاں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ علاوہ فنِ شاعری کے نجُوم میں ماہر تھے اور موسیقی کا شوق بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ ستار خوب بجاتے تھے۔ اوّل نواب محبّت خاں خلف حافظ رحمت خاں نواب بریلی کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ میر انشاء اللہ خاں اور اُن کی صحبتیں بہت گرم رہتی تھیں۔ چنانچہ حسبِ حال یہ شعر کہا تھا ؎

بس کہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے
ہوئے نوکر بھی تو نواب محبّت خاں کے

۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوئے ایک دفعہ تنخواہ کو دیر ہوئی۔ حسنِ طلب میں غزل کا مقطع لکھا ؎

جراًت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم
کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیماں کب دے

فارسی کی ضرب المثل ہے۔ تا خدا نہ دہد سلیماں کے دہد — میاں جراًت کے حال میں بلکہ ساری کتاب میں افسوس کی بات تو یہ ہے کہ عین جوانی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حادثہ چیچک سے ہوا مگر اُستاد مرحوم نے ایک دن فرمایا کہ بھئی زمانے کی دو آنکھیں ہیں۔ نیکی کی آنکھ نے اُن کے کمال کو بڑی قدردانی سے دیکھا۔ بدی کی آنکھ نہ دیکھ سکی اور ایک بدنما داغ اُن کے دامن پہ دکھایا۔ مشہور کرتے ہیں کہ پہلے وہ اصلی اندھے نہ تھے۔

بعض ضرور توں سے کہ شوخیٔ عمر کا مقتضٰے ہے خود اندھے بنے۔ رفتہ رفتہ اندھے ہو گئے۔

بزرگوں کا قول ہے کہ شرافت اور نجابت غریبی پر عاشق ہے۔ دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہے۔ یہ حق ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شرافت کے اصول و آئین غریبوں ہی سے خوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی قیامت آئی، دولت آئی شامت آئی۔ میاں جرأت کی خوش مزاجی لطیفہ گوئی مسخراپن کی حد سے گزری ہوئی اور ہندوستان کے امیروں کو اس سے ضروری نہ کوئی کام نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہے۔ کہتے ہیں مرزا قتیل، سیدؔ انشاؔ کا اور اُن کا یہ حال تھا کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے آج ایک امیر کے ہاں ہیں، دُوسرے دن دُوسرے امیر آئے۔ سوار کیا اور ساتھ لے گئے۔ چار پانچ دن وہاں رہے۔ کوئی اور نواب آئے وہاں وُہ لے گئے۔ جہاں جائیں آرام و آسائش سے زیادہ عیش کے سامان موجود رات دن قہقہے اور چہچہے۔ ایک بیگم صاحب نے گھر میں اُن کے چٹکلے اور نقلیں سُنیں۔ بہت خوش ہوئیں اور نواب صاحب سے کہا کہ ہم بھی باتیں سُنیں گے۔ گھر میں لا کر کھانا کھلاؤ۔ پردے یا چلمنیں چھُٹ گئیں۔ اندر وُہ بیٹھتیں، باہر یہ بیٹھتے۔ چند روز کے بعد خاص خاص بیبیوں کا برائے نام پردہ رہ گیا۔ باقی گھر والے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت ہوئی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں۔ گھر میں کوئی دادا نانا، کوئی ماموں چچا کہتا شیخ صاحب کی آنکھیں دُکھنے آئیں۔ چند روز ضعفِ بصر کا بہانہ کر کے ظاہر

گیا کہ آنکھیں معذور ہوگئیں مطلب یہ تھا کہ دیدار سے آنکھیں سُکھ پائیں۔ چنانچہ بے تکلّف گھروں میں جانے لگے۔ اب پردے کی ضرورت کیا؟ یہ بھی قاعدہ ہے کہ میاں بیوی جس مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں نوکر اُس سے جلنے لگتے ہیں۔ ایک دن دوپہر کو سوکر اُٹھے۔ شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھر لا — لونڈی نہ بولی۔ انھوں نے پھر پکارا اُس نے کہا کہ بیوی جا ضرور میں لے گئی ہیں۔ اُن کے مُنہ سے نکل گیا کہ غیبانی دوانی ہوئی ہے۔ سامنے تو رکھا ہے، دیتی کیوں نہیں۔ بیوی دوسرے دالان میں تھیں۔ لونڈی گئی کہ وُئی بیوی! یہ مُوا کہتا ہے کہ وُہ بندہ اندھا ہے۔ یہ تو خاصا سُجھّا ہے۔ ابھی میرے ساتھ یہ واردات گزری۔ اُس وقت یہ راز کُھلا۔ مگر اِس میں شبہ نہیں کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے[۱]۔"

ہر چند کہ آزاد کی بنائی ہُوئی جرأت کی یہ تصویر بڑی حد تک خیالی ہے اور اِس میں اُن کے ذہن و تخیل کے رنگ بڑے گہرے ہیں۔ لیکن اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ میاں جرأت کی زندگی کا انداز کیا تھا؛ وُہ کِس ماحول کی پیداوار تھے؛ اور اس ماحول میں اُن کی کیا کیفیّت تھی؛ اِس کیفیّت کی جھلک اُن کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ قدم قدم پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وُہ اُن کی شخصیت کا صحیح آئینہ ہے — اپنی شاعری میں وُہ حُسن کا بیان کرتے ہیں۔ اُس کے سراپا کی تصویریں کھینچتے ہیں اور اُس کے باعث جسم اور رُوح میں جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے اُس کی مصوّری کرتے ہیں۔ وُہ انسان اور انسانی زندگی کے جسمانی اور جذباتی رشتوں کے شاعر ہیں — اِن رشتوں کے مختلف پہلوؤں کی ساری تفصیل و جُزئیات اُن کی شاعری میں پوری طرح بے نقاب نظر آتی ہے۔

---

[۱] آزاد: آبِ حیات: ص ۲۳۸، ۲۳۹

جرأت پُر گو شاعر تھے۔ اُنھوں نے تقریباً تمام اصنافِ سُخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُنھوں نے غزلوں کا ایک ضخیم دیوان چھوڑا ہے۔ اس کے علاوہ مثنویاں، رُباعیاں، مخمّس، مسدس، ہفت بند، مرثیے اور سلام بھی لکھے ہیں۔ اُن کے کلام کا انتخاب تو کئی بار شائع ہوا جس میں سب سے اہم وُہ ہے جس کو مُمتازالشعرا، کے سلسلے میں سیّد حُسین بلگرامی نے ۱۸۹۷ء میں آگرے سے شائع کیا تھا۔ کُلیاتِ جرأت صرف ایک بار ۱۸۸۳ء میں مطبع کارنامۂ لکھنؤ میں بہ اہتمام محمّد یعقوب چھپ کر شائع ہُوا لیکن یہ اب بالکل نایاب ہے۔ اس کا ایک نُسخہ راقم کے پاس موجُود ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ دُوسری اصناف بھی ہیں۔ لیکن یہ بھی جرأت کا مکمّل کُلیّات نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے مُرتّب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اُس نے سات نُسخوں کو سامنے رکھ کر اِس کو مُرتّب کیا ہے۔ اِس نسخے کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے:

"کلامِ دلفریبِ عاشقانہ و نظمِ دلپسندِ شعرائے زمانہ بُلبُلِ شیریں زباں، عندلیبِ سحر بیاں، مملو بہ فصاحت و بلاغت یعنی کُلّیاتِ شیخ قلندر بخش جرأت شاگرد مرزا جعفر علی حسرت جس کا ایک عالم مشتاق نظر آتا تھا۔ متلاشی نایابی سے صدمۂ حرمان اُٹھاتا تھا۔ ہیچمیرز نے بڑی تلاش سے سات نُسخے بہم پہنچا کے مقابلہ کیا اور بعد تکمیل و ترتیب حلیۂ تصحیح سے آراستہ کر کے کاغذ فرنچ پر چھاپ دیا اور صفحے میں پچاس شعر لکھے تا کہ یہ دفترِ عظیم ضخامتِ قلیل قبول کر لے تاکہ ناظرین کو سیر کرنا شاق اور شائقین کو مول لینا دُشوار نہ گزرے۔ چُنانچہ ماہِ ربیع الثانی ۱۳۰۰ھ کو مطابق فروری ۱۸۸۳ء میں کُلّیات زیورِ طبع سے پیراستہ ہو کر مثلِ یوسفِ کنعان بازارِ مصر میں شائع ہُوا۔"[۱]

اس نُسخے میں غزلوں کے علاوہ دُوسری اصناف بھی ہیں، لیکن جرأت کی چند طویل مثنویاں

---

[۱] کلّیاتِ جرأت: مطبوعۂ کارنامۂ لکھنؤ: ص ۲۷۲

اور مراثی و سلام اِس نسخے میں نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مرتب کرنے والے نے جن قلمی نسخوں کو اپنے سامنے رکھا اُن میں مثنویاں اور مراثی و سلام موجود نہیں تھے۔

جُرأت کے کلام کے بے شمار قلمی نسخے ہندوستان، پاکستان اور انگلستان کے کُتب خانوں میں ملتے ہیں۔ اِن میں سب سے زیادہ اہم دو ہیں۔ ایک تو برٹش میوزیم لندن کے کتب خانے میں ہے اور دوسرا پنجاب یونیورسٹی لاہور میں —— برٹش میوزیم کا نسخہ نہایت خوبصورت نستعلیق میں اعلےٰ درجے کے کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ جرأت کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا۔ اِس میں ۲۸۴ ورق ہیں۔ پہلے ۳۰۷ صفحات میں غزلیں ہیں۔ اس کے بعد فردیات، رباعیات، مُسدّس، مُخمّس، ہفت بند، ترجیع بند، مقطع، سلام، مرثیے اور مثنویاں ہیں۔ یہ نسخہ محمدؐ خاں صاحب کے لیے لکھا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے:

"تمام شد کلیاتِ میاں جرأت از برائے خاطر داشت محمدؐ خاں سلّمہ اللہ تعالیٰ از دستِ احقر العباد محمدؐ امین بیگ ساکن دہلی غفر اللہ ذنبہ"[۱]

اِس نسخے میں ایک طویل غیر مطبوعہ عشقیہ مثنوی بھی شامل ہے جس کا تاریخی نام "داستانِ حُسن و عشق" ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۹۱ھ میں لکھی گئی۔ اِس میں کوئی ۹۰۰ کے قریب اشعار ہیں۔ اس تصنیف کا سبب جرأت نے مندرجۂ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے ؎

مجھے مدّت ہوئی یہ جستجو تھی ۔۔۔ یہی خواہش تھی اور یہ آرزو تھی
کہ اک قصہ سُناوے کوئی مغموم ۔۔۔ تو اس کو کیجیے ہندی میں منظوم
ولے قصہ وہ دردِ عشق کا ہو ۔۔۔ کہ جوں کوئی سُنے دیوے وہیں رو
سو کانوں بھی سُنا آنکھوں بھی دیکھا ۔۔۔ رہا ہر گز نہ کچھ خطرہ بُرے کا
کیا ہیں من و عن سب اُس کو تحریر ۔۔۔ نہیں جھوٹی سرِ مُو، میری تقریر

---

[۱] کلیاتِ جرأت، قلمی نسخہ برٹش میوزیم: ص ۴۲۸

یہی ہے فرق افسانوں میں اس میں　　دروغ و راستی دیکھو ہو کس میں

سُنی کہتے ہیں سب دیکھی کہی میں　　اُنھوں نے جھوٹ اور سچّی کہی میں

یہی تاریخ اب اس کی عیاں ہے

یہ حُسن و عشق کی اک داستاں ہے

یہ مثنوی پنجاب یونیورسٹی لاہور کے قلمی نسخے میں بھی موجود ہے۔ یہ نسخہ بھی خاصا اہم ہے کیونکہ یہ بھی جرأت کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا۔ اُس کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے:

"برائے جناب نواب محبّت خاں پسر نواب حافظ رحمت خاں صاحب، نوشتہ، فقیر منہاس الدّین لکھنوی، ۱۴ شعبان ۱۲۲۳ھ"[1]

برٹش میوزیم لندن اور پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ان دونوں قلمی نسخوں میں ایک فرق یہ ہے کہ میوزیم کے نسخے میں جرأت کے کچھ مراثی اور سلام بھی شامل ہیں جو پنجاب یونیورسٹی کے نسخے میں نہیں ہیں۔ اسپرنگر نے اپنی اودھ کیٹلاگ میں کلّیاتِ جرأت کے ایک قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے جس میں جرأت کے مراثی و سلام موجود تھے۔ میں نے جب سے اسپرنگر کا یہ بیان پڑھا تھا، مجھے ان مراثی و سلام کی تلاش تھی۔ اتفاق سے مجھے یہ مراثی و سلام برٹش میوزیم کے قلمی نسخے میں مل گئے۔ جرأت کے کسی اور قلمی نسخے میں یہ مراثی و سلام موجود نہیں ہیں۔ اس لیے میں نے ان کو مرتب کر کے شائع کرنا مناسب سمجھا۔

یہ مراثی و سلام اُردو مرثیے کی روایت میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ ایک ایسے شاعر کی تخلیق ہیں جو زندگی بھر اپنی شاعری میں حُسن و عشق کے اسرار و رموز کو بے نقاب کرتا رہا لیکن جس کا دل عشقِ رسولؐ اور اہلِ بیتؑ کی محبت سے سرشار تھا۔

---

[1] کلیاتِ جرأت: قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

اسی لیے ان مراثی و سلام میں صداقت اور جذبۂ خلوص نے دردمندی اور گداز کی وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جو اس قسم کی شاعری کی جان ہے۔ یہ مراثی و سلام اُس زمانے میں لکھے گئے ہیں جب اُردو شاعری میں اس فن کی کوئی عظیم اور مستقل روایت قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے یہ کچھ اور بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ان کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ان کو شائع کیا جاتا ہے۔

عبادت

شعبۂ اُردو و ثقافتِ پاکستان
اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
یونیورسٹی آف لندن

۲۵ جلائی سنہ ۱۹۶۶ء

مرثیہ امام علیہ السلام

جب چلا شہر مدینہ سے حسینا ہے ہے — رو کے یوں کہنے لگی فاطمہ صغریٰ ہے ہے
کیا مرے حق میں یہ تم کرتے ہو بابا ہے ہے — چھوڑتا ہے کوئی بیمار کو تنہا ہے ہے
جب میں گھبراؤں گی گھر میں تو کدھر جاؤں گی
بستر غم پہ مگر رو کے میں مر جاؤں گی

اب تلک جیتی ہوں تیرے ہی کرم سے بابا — جی نہ ٹھہرے گا ہرا جانے کے غم سے بابا
اور مر جاؤں گی جلدی اس الم سے بابا — زندگانی ہے مری تیرے ہی دم سے بابا
ہائے جس وقت نہ تو مجھ کو نظر آوے گا
تن میں جی میرے بھلا کیونکہ نہ گھبراوے گا

ہائے بابا مجھے کچھ نہ وطن ہی میں غریب — کیا دوا ہوگی مری کون بلائے گا طبیب

مجھ سے دوری نہیں لازم کہ ہوں مرنے کے قریب — آرزو ہے کہ ترے ہاتھ کی ماٹی ہو نصیب

دم آخر جو چوائے گا تو منہ میں پانی

بعد مرنے کے نہ بھٹکے گی مری روح آنی

اپنا احوال کہوں تجھ سے میں تاکے بابا — بے طرح غم سے مری جان گئے دیتے بابا

لیتے ہیں ہاتھ میں بیمار کا دل اے بابا — اور تم مجھ کو کڑھانے لگے ہے ہے بابا

اک تو بیمار ہوں اور تس پہ جو غم کھاؤں گی

کل جو مرتی ہوں گی سو آج ہی مر جاؤں گی

مجھ کو تم سے ہے محبت مجھے تم پر ہے پیار — تم بنا زیست جو میری ہو سو ہے یہ دشوار

چھوڑ کر جاتے ہو کیوں گھر میں مجھے تم بیمار — کچھ رہے گا نہ مرا اپنے یگانوں میں شمار

ہو مرض جن کو انھیں چھوڑ کوئی جاتا ہے

سب کو بیمار کے احوال پہ رحم آتا ہے

رو دیا سرورِ دیں نے یہ جونہی اُس نے کہا　　اور شفقت سے لیا گود میں بیٹی کو بٹھا

دے دلاسا کہا تیرا ہے نگہبان خُدا　　کیونکہ بیمار کو دُوں ہمسفر کا میں بھلا

چین گر رہ کے ذرا بھی میں کہیں پاؤں گا

بھیج کر بھائی کو تیرے تجھے بُلواؤں گا

کہ کے یہ شاہ جو رخصت ہُوا آفت آئی　　لگ کے کیا کیا گلے ہر ایک کے وہ چلائی

ہُوا بیمار کو یہ اور الم تنہائی　　گاہ یاد آتا تھا بابا اُسے گاہے بھائی

اس میں گھبرا کے جو دروازے تلک جاتی تھی

سر کو پھر آن کے دیوار سے ٹکراتی تھی

کبھو مُنہ ڈھانک کے بستر پہ جو روتی تھی پڑی　　آنسوؤں بہتے تھے جیسے لگے ساون کی جھڑی

کبھو اُٹھ بیٹھتی تھی اور کبھو ہوتی تھی کھڑی　　بیقراری سے اُسے چین نہ تھا ایک گھڑی

صُورت ہر ایک کی جب یاد اُسے آتی تھی

چار سُو دیکھ وُہ من مار کے رہ جاتی تھی

کبھو روتی تھی کہ ہے ہے مرے پیارے بابا آ بنی جان پہ جانے سے تمہارے بابا
میں تو مرتی ہی تھی بیماری کے مارے بابا کیوں مجھے چھوڑ گئے بمایہ سدھارے بابا
اور بھی ٹوٹ پڑا دل پہ مرے غم کا پہاڑ
گھر کو دیکھوں ہوں تو گویا نظر آتا ہے اُجاڑ

اُٹھ نہیں سکتی ہوں طاقت یہ ہوئی ہے زائل تم مسافر جو ہوئے چھوڑ کے مجھ کو بیدل
کون پہنچائے گا میرے تئیں اوّل منزل اپنا انجام نظر آتا ہے مجھ کو مشکل
جیتی رہتی نہ تو کاہے کو یہ غم کھاتی میں
ایسے جینے سے تو بہتر تھا کہ مر جاتی میں

غش پہ غش ایک تو ناطاقتی سے آتا ہے خالی دیکھوں ہوں تو گھر کاٹے مجھے کھاتا ہے
دل کا ارمان مرے دل میں رہا جاتا ہے اب تو مرنے کے سوا کچھ نہیں بن آتا ہے
یوں ہی رو رو کے میں ننھا سا جی اپنا دوں گی
تم مسافر ہوئے تو میں بھی مسافر ہوں گی

کبھی کہتی تھی کہ ہے ہے مرے بھیّا اکبرؑ چھوڑ کر تم بھی گئے اپنی بہن کو مضطر

یہ نہ سمجھے کہ یہ بیمار ہے میری خواہر ہائے بھیّا تمھیں بھی رحم نہ آیا مجھ پر

اب کسی شکل سے تم جلد پھر آؤ یک بار

آخری تم کو اگر دیکھنا ہو شوقِ بسیار

چین بے تابی سے اس کے دلِ مضطر کو نہ تھا گھر کو یوں دیکھتی تھی جیسے ہو کوئی کانورلساؔ[1]

اُٹھتی بستر سے تو ناطاقتی دیتی تھی گرا ضعف سے رہتی تھی ناچار پڑی وہ دُکھیا

گھر تھا زنداں اُسے اور اس میں وہ یوں تھی دلگیر

قید خانے میں کوئی جیسے کہ رہتا ہو اسیر

ننّھے بھائی کی جو صورت اُسے یاد آتی تھی چُپنی آنکھوں سے لگا اُس کو وہ چلّاتی تھی

اور قربان شلوکے کے اوپر جاتی تھی ماں لئے پاس کھڑی اُس کے یہ فرماتی تھی

اب جھولاؤں گی میں کیونکر مرے پیارے اصغرؑ

چھوڑ بیمار مجھے تم تو سدھارے اصغرؑ

---

[1] بہ معنی مدہوش اور پریشان حال۔ متروک ہے

ہائے بھیا گئے تم اور رہی میں بیمار پھر ترے درد جدائی سے یہ کیونکر آزار

سانس لینا بھی ہوا ہے مجھے اب تو دشوار نہ تو جی کو ہے مرے صبر نہ ہے دل کو قرار

گھر جو خالی نظر آتا ہے تو گھبراتی ہوں

کبھی چپ بیٹھتی ہوں اور کبھی چلاتی ہوں

کاش مجھ سے نہ جدا ہائے تو بھیا ہوتا اور جدا کرتے تجھے لوگ تو رونے لگتا

دیکھ روتے تجھے ہر کوئی مقرر کہتا نہ جدا کیجیو لڑکا یہ بھڑک جائے گا

مصلحت پھر تو مقرر یہی ٹھہراتے سب

لے چلو ساتھ اسے بھی کہ یہ بیمار ہے اب

گھٹنیوں چلنا جو اصغر کا وہ یاد آتا تھا تن سے بیمار کا جی ہائے چلا جاتا تھا

اپنا جینا نہ کسی شکل اسے بھاتا تھا دل میں اس بچی کے درد کے یہی آتا تھا

دیکھوں اب ملتی ہوں اپنوں سے میں کیونکر مجبور

طاقت اٹھنے کی نہیں اور گیا قافلہ دور

دل ہی دل میں کبھی کہتی تھی یہ با دیدۂ تر
مجھ سے بیمار کا دیکھوں کہ ہو جینا کیونکر

اُمّ سلمٰے مری نانی جو ہے گھر کے اندر
ایک تو میری بزرگ اور بڑھاپا سر پر

مجھ کو لازم ہے کہ خدمت میں اُنھوں کی میں ہوں
کام کو پاس ادب سے بھلا کس مُنہ سے کہوں

ہائے یاد آتی تھی جس وقت سکینہ اُس کو
بد تر از مرگ نظر آتا تھا جینا اُس کو

یاں تلک سُوجھتا تھا کوٹنا سینہ اُس کو
کہ بس آتا تھا پسینے پہ پسینہ اُس کو

اور بیمار کا آزار جو بڑھ جاتا تھا
ضُعف سے دو دو پہر تک اُسے غش آتا تھا

غش سے کچھ آتی افاقت تو یہ کہنا ہر آن
نہ دیا ساتھ مرا تُو نے بھی کیوں بھیّا جان

اپنی تنہائی پہ اب کیونکہ نہ ہُوں میں حیران
پیاسی ہوتی ہوں تو بس اینٹھنے لگتی ہے زبان

بستے گھر میں ہُوئی یک بارگی یہ ویرانی
نہ رہا کوئی کہ ٹک مجھ کو پلا دے پانی

ہائے اُوجڑ سا نظر آتا ہے سب گھر مجھ کو　　کروٹ بھی دلاتا نہیں آ کر مجھ کو

یاد آتے ہیں جو ہمشیرہ و برادر مجھ کو　　دھیان کیا جانیے لے جائے ہے کیدھر مجھ کو

جو مرا حال ہے سو اب کسے دکھلاؤں میں

جی میں آتا ہے کہ سر پھوڑ کے مر جاؤں میں

اک تو بیمار ہوں اور تس پہ جدائی کا ہے غم　　شمع ساں اٹھتے ہیں شعلے مرے جی سے ہر دم

تن سلگتا ہے پڑا اور ہیں آنکھیں پُرنم　　طپشِ جاں کہوں کس سے کہ یہ ہے عالم

سوزِ ہجراں کو زباں پہ جو ذرا لاؤں میں

کھینچوں گر آہِ شرربار تو جل جاؤں میں

نہ تو بہار کے دل کو کوئی بہلائے اب　　نہ کوئی پوچھے ہے غم جس سے کہوں رنج و تعب

نہ تو ملتی ہے دوا اور نہ غذا ہائے غضب　　رات تنہائی میں کٹ جائے مجھے جاگتے سب

پیار کرنا مجھے بابا کا جو یاد آتا ہے

طائرِ جاں قفسِ تن سے اُڑا جاتا ہے

یاد آتی تھی وہ صورت اُسے جب مادر کی	شکل ہو جاتی تھی تب کچھ عجب اُس مضطر کی

نہ تو رہتی تھی خبر اپنی نہ سُدھ بُدھ گھر کی	شکل مُردے کی سی ہو جاتی تھی سب پیکر کی

اُمِّ سلمےٰ اُسے کچھ کہہ کے جو سمجھاتی تھی

اور رو رو کے وہ بے حال ہوئی جاتی تھی

یہی بیمار وہ رو رو کے کہے تھی ہر آن	کیسی کی حق میں مرے تم نے یہ اے بابا جان

گر یہی غم ہے تو میں جان سے جاؤں گی نِدان	دم لبوں پہ ہے مِرا ہوں کوئی دم کی مہمان

دل میں حسرت رہے ملنے کی جو دم جاوے چُھوٹ

ہائے اس وقت کیا تم نے یہ کیا مجھ سے سلوک

ہائے کیا مجھ ہی کو کرتے تھے تم اے ابّا پیار	جو گیا اور بھی دے درد جُدائی بیمار

ہے ستم میرا ہی کیا ساتھ لے جانا تھا بار	ہائے کیا میری ہی خاطر تھی سواری دُشوار

ہائے اب دم جو مرے تن سے نکل جاوے گا

کون کفناوے گا اور کون اِسے دفناوے گا

اپنی صُورت مجھے اب آن کے جلدی دکھلاؤ　　فاطمہ صُغریٰ تمھارے گئی صدقے آؤ
یا جہاں جا کے رہے ہو وہیں تم بلواؤ　　عالمِ نزع ہے ہر شکل مُجھے چھڑواؤ

لو خبر جلد مری غم نے کیا ہے ہلکان
گر یہی غم ہے تو مر جاؤں گی اے امّاں جان

کبھی بہنوں کی جو صُورت اُسے یاد آتی تھی　　شکلِ تصویر وُہ حیران سی رہ جاتی تھی
غم اُسے کھاتا تھا، اُس غم کو جو وہ کھاتی تھی　　کچھ خموشی کے سوا بات نہ بن آتی تھی

دل میں یہ سوچ کے سر زانُو پہ اُس کے دھرنا
ہو کے بیکس مری قسمت میں لکھا تھا مرنا

کبھی عباسؑ کو کر یاد یہ کہتی رو رو　　کیوں چچا جان گئے چھوڑ کے تُم بھی مجھ کو
مخلصی غم سے ہو مُجھ کو جو یہ تُم جانتے ہو　　لو خبر آن کے جلد اپنی بھتیجی کی تو

کوئی قاصد بھی نہیں بھیجوں جسے مَیں رنجُور
اِک تو بیمار ہوں اور دُوسرے ہوں بے مقدُور

گود میں بی بی سکینہ کو بٹھاتی ہو گی ننھے بھائی کو بھی چھاتی سے لگاتی ہو گی

ہوں گے جو مانگتے وہ اُن کو دلاتی ہو گی پر رُلاتی اُنھیں ہو گی نہ کُڑھاتی ہو گی

فکر ہو گا تمھیں ہر ایک کی دلداری کا

ہائے پر دھیان نہ آیا مری بیماری کا

یہ سمجھتی ہوں کہ تُم اپنے ہو بچوں! پر جی پاس ہیں ہوتی تو کاہے کو یہ حالت ہوتی

مَیں جو بیمار ہوئی ہائے وُہ تھی کون گھڑی مُفت میں جاتی ہے اب ہائے چچا جان مری

مُجھ سے کیوں رشتۂ اُلفت کے تئیں توڑ گئے

گھر میں بیمار جو تنہا مجھے تُم چھوڑ گئے

کبھی لہر آتی جو رونے کی تو یاں تک رونا کہ رہی جتنی بھی طاقت اُسے رو رو کھونا

اور حیرت سے کبھی دیکھنا اِک اِک کونا روز و شب دردِ جُدائی سے نہ اِک دم سونا

اور کچھ کام نہ تھا اُس کو سحر سے تا شام

آہیں بھرتی تھی وُہ ایک ایک کا لے لے کر نام

رحم کھا کر کوئی ہمسائی جو آتی تھی کبھی — اور یہ دیتی تھی تسلی کہ نہ رو اے بی بی
شکل کوئی روز کو تو دیکھتی ہے بابا کی — باتیں کر مجھ سے تو بہلا کوئی دم اپنا جی

تو یہ کہتی تھی وہ درد اپنے سے با آہ و فغاں
لو بتا دو مجھے وہ قافلہ پہنچا ہے کہاں

اور بہلانے کو تم دل کے جو کہتی ہو ہائے — تو یہ فرماؤ کہ کس بات سے اب دل بہلائے
جس کو بیمار سمجھ چھوڑ کے گئے سب جائے — جب وہ بے چین ہو تب گھر میں نظر کوئی نہ آئے

بیٹھے پھر چین سے کیا خاک نہ رووے کیوں کر
رو رہے بے چین وہ غمناک نہ ہووے کیوں کر

کبھی سنتی تھی کہانی میں جو میں اپنا حال — کہ بچھڑ کر کوئی اپنوں سے ہوا کیا بد حال
ہائے تو کیا ہی گزرتا تھا مرے دل پہ ملال — سو اب اپنے ہی پر اس بات کو کرتی ہوں خیال

کیا کہوں سخت مری جان پہ ہے اب تو عذاب
یہ دعا مانگو کہ چھوٹ جاؤں میں اس غم سے شتاب

نہ تو صورت نظر آتی ہے مجھے اکبرؑ کی — نہ مجھے شکل نظر پڑتی ہے اب اصغرؑ کی
شکل آنکھوں سے نہاں ہو گئی سارے گھر کی — ہائے کچھ پوچھو حقیقت نہ تم اس مضطر کی

فاطمہ صغراؑ کا غم اس کو ہوا ہووے گا
پیارے سے جو کوئی اپنے کے جدا ہووے گا

ہائے کیا فاطمہ صغراؑ کی کہوں زاری ہائے — کہ رہی کیونکہ وہ تنہائی میں بیچاری ہائے
تھی اُسی دم اُم مصیبت میں گرفتاری ہائے — اشک گرم آنکھوں سے رہتے تھے سدا جاری ہائے

مطلع اُس کے جو احوال سے کوئی ہوتا تھا
سوچ کر اُس کی مصیبت کو بہت روتا تھا

عرض یہ جرأتِ مداح کی ہے اس سے سدا — ہووے مقبول کلام اب یہ مرا بہرِ خدا
دل پہ غیر از غمِ شبیرؑ الم ہو نہ ذرا — یاں نہ محتاج ہوں میں کوئے نجف کا ہوں گدا

جلد آنکھوں میں میں اب اپنی بصارت پاؤں
تا بہ سوئے نجف از بہرِ زیارت جاؤں

○

مرثیہ دیگر

(۱)

شبیرؑ کا الم میں کہوں کس زبان سے
جاتا سجا ہے ماتم سرورؑ میں جان سے
عالم یہ ہے جو دیکھیے عالم کو دھیان سے
گویا زمیں پہ برسے ہے غم آسمان سے

(۲)

اس غم سے آسمان ہے گردش میں روز و شب
روتا ہے ابر بھی اسی ماتم میں روز و شب
کیا قہر ہے کہ بستی ہے بستی جہاں کی سب
اور تھے جو مالک اٹھ گئے وہ درمیان سے

(۳)

کیا واقعہ بیان کروں کربلا کا وائے
کنبے کو ساتھ لے کے جو تشریف شاہ لائے
اس قافلے کی شکل ہوا حال سب کا ہائے
جیتا پھرے نہ ایک بھی جس کا روان سے

(۴)

بھائی بھتیجے بیٹوں کے سر ہو گئے قلم   عُریاں سب اہلِ بیتؑ ہُوئے سب اسیرِ غم
چھُوٹا تھا کس گھڑی سے مدینہ کہ ہے ستم   سب کربلا میں آ کے گئے اپنی جان سے

(۵)

راوی کہے ہے یُوں کہ جو اب سر ہُوا تمام   دیکھا امامؑ نے کہ سبھی آئے اب تو کام
مرنے پہ باندھنے لگے اپنی کمر امامؑ   اور کچھ کہا نہ حرفِ رضا چھُٹ زبان سے

(۶)

بستر پہ تھا جو عابدِ رنجُور و ناتواں   پہنچی خبر جو کان تک اُس کے یہ ناگہاں
یعنی چلے ہیں مرنے کو اب شاہِ دو جہاںؑ   گرچہ ہِلا نہ جاتا تھا اُس نوجوان سے

(۷)

لیکن خبر یہ سُنتے ہی بس کانپتا اُٹھا   اور لڑکھڑا کے ہاتھ میں اپنے عَلَم لیا
کی عرض یہ پدر سے کہ ہرگز تمہیں شہا   جیتے جی اپنے جانے نہ دوں گا مکان سے

(۸)

ہے بھائیوں چچوں کا مجھے آگے ہی الم
یعنی کہ ساتھ دے نہ سکا مَیں مریضِ غم
کن آنکھوں سے یہ دیکھوں کہ تم جاؤ ہے ستم
اور مَیں تمھارے سامنے جاؤں نہ جان سے

(۹)

جانِ اکبرؑ اپنی دے دیوے تو جی کیونکہ میں نہ دُوں
قاسمؑ سا بھائی یاں مرے اور مَیں یہاں رہُوں
عباسؑ سا چچا نہ بچے اور مَیں جیوں
بہتر ہے حق میں اب مرے اُٹھنا جہان سے

(۱۰)

گرچہ بدن میں تپ سے حرارت تھی آگے ہی
دِن رات مجھ کو بسترِ غم پر تھی بے کلی
پہ غم سے اَقربا کے مرے آگ سی ہے لگی
جوں شمع شعلے اُٹھتے ہیں ہر استخوان سے

(۱۱)

عابدؑ تو کر رہا تھا یہ بابا سے دُکھ بیاں
جو آئی بانو کرتی ہُوئی نالہ و فغاں
مُردہ سا ہاتھوں پہ دھرے اصغرؑ کو ناگہاں
نکلی زبان بچے کی تا لب دہان سے

(۱۲)

تھی تین دن سے ننھّے سے بچّے کو تشنگی　　سارے بدن پہ پھر گئی تھی اُس کے مُردنی
منکا ڈھلا تھا اور تھی پُتلی پھری ہوئی　　احوال اُس نبچے کا ہے باہر بیان سے

(۱۳)

بانو نے پاس لا کے شہِ دین کو کہا　　مہمان کوئی دم کا ہے اصغرؔ مرا بچا
ہو زندگی دوبارا جو پانی ملے ذرا　　ایسے میں تم جُدا نہ ہو اِس نیم جان سے

(۱۴)

ڈھارس تمہارے ہونے سے جی کو بڑی ہے شاہ　　کیوں ہم کو چھوڑ جاتے ہو اس وقت میں تم آہ
حال اس طرف تو پیاس سے اصغرؔ کا ہے تباہ　　اور اس طرف سکینہ بھی جاتی ہے جان سے

(۱۵)

بس واسطے خدا کے ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ　　ہم روتوں کو تم اور بھی اے شاہ مت کُڑھاؤ
جانے دو بیٹھو عازمِ میداں نہ ہو تم آؤ　　جو اُس طرف گیا سو گیا بس جہان سے

(۱۶)

بانو تو کر رہی تھی یہ سرور سے التماس
اتنے میں دوڑی آئی سکینہ بھی بے حواس
بولی قبول ہے مجھے بابا یہ بھوک پیاس
تم مجھ کو چھوڑ جاؤ نہ باہر مکان سے

(۱۷)

اے لو بلائیں لیتی ہوں میں ننھے ہاتھوں سے
ہے ہے نہ جاؤ یاں سے کہیں مجھ کو چھوڑ کے
بابا یہ سن لے عرض مری صدقے گئی ترے
کہتی ہوں رو کے تجھ پدرِ مہربان سے

(۱۸)

اصغر جو چل کے گھٹنیوں آجاتا تھا ذرا
تو ننھے بھائی ساتھ بہلتا تھا جی مرا
اب میں جُدی پیاسی ہوں غش میں ہے جی جُدا
ہم دونوں ہارے پیاس کے ہیں ناتوان سے

(۱۹)

سرور نے دے دلاسا کہا رو نہ اے بچی
پانی تلاش کر کے میں لاتا ہوں اس گھڑی
بجھ جائے تا کہ تشنگی اصغر کی اور تری
کیونکر یہ لب کا چاٹنا دیکھوں زبان سے

(۲۰)

یہ بات کہہ کے بانو سے اصغر کو پھر لیا
تب اُس نے ہاتھ جوڑ کے سرور سے یوں کہا
بچہ تمہی رہا ہے اسے دیکھیو شہا
پہنچے الم نہ صدمۂ تیر و سنان سے

(۲۱)

سرور یہ بولے بانو زباں پر نہ تم یہ لاؤ
یہ ہے صغیر اس پہ لگاوے گا کون گھاؤ
میں اس کو لے کے جاتا ہوں تم گھر میں بیٹھ جاؤ
اللہ بچاوے اس کو تمہارے گمان سے

(۲۲)

ہے ہے میں کیا کہوں جو نہی اصغر کو لے کے شاہ
واں آئے جس جگہ کہ وہ بے دین تھے روسیاہ
پانی کے مانگتے ہی کسی بے حیا نے آہ
اک تیرِ مرگ جوڑ کے مارا کمان سے

(۲۳)

لگتے ہی تیر حلق تو بچے کا چھد گیا
اُس تین دن کے پیاسے نے اپنا لہو پیا
اک بار تن سے طائرِ روح اس طرح اُڑا
پرواز جیسے مرغ کرے آشیان سے

(۲۴)

شبّیر کا بھی چھوٹ کے بازو لہو بہا　　　اصغر کو دیکھ کہتے تھے اے وا مصیبتا
بانو کی جا کے گود میں دوں کس طرح بھلا　　　ہم اب تو دونوں ہوگئے لوہولہان سے

(۲۵)

ہے ہے کہے گی دور ہی سے وہ تو دیکھ کر　　　کیا گزری لال پر مرے جو شہ ہے خوں میں تر
کیا دوں اب اُس کو جس نے کہ جیتا دیا پسر　　　بچے کی راہ دیکھتی ہوگی جو دھیان سے

(۲۶)

کیا کیا وہ شاد ہووے گی یہ دل میں کرکے آس　　　آتا ہے پانی پی کے مرا لال میرے پاس
بس دیکھتے ہی اُس کے تو اُڑ جائیں گے حواس　　　نظریں ملیں گی کیسے شہادت کی شان سے

(۲۷)

چمکار کر یہ کہتی وہ ہوگی سکینہ کو　　　لے آئے بھائی پانی تیرا تو بھی پیجیو
اب کیونکہ جاؤں شرم سی آتی ہے مجھ کو تو　　　اس گفتگو سے بانو کی اور اس بیان سے

(۲۸)

یارو مقام گریہ ہے انصاف کیجو اب — پانی حسینؑ مانگے اور اصغرؑ ہو تشنہ لب
جس کے عوض گلے پہ لگے تیر ہے غضب — کرتا ہے یہ سلوک کوئی بے زبان سے

(۲۹)

پہلے تو سوچ دل میں بہت شاہ کے رہے — راضی ہو پھر رضا پہ طرف خیمے کے چلے
آتے بس اُن کو دُور سے دیکھا جو بانو نے — کپڑے نظر کچھ آنے لگے خوں فشاں سے

(۳۰)

یہ رنگ دیکھتے ہی وہ بے حال ہو گئی — بولی کہ شکل کیا تیری اے لال ہو گئی
ہے ہے غم و الم سے میں پامال ہو گئی — یارب مجھے تو جلد اُٹھا لے جہان سے

(۳۱)

اتنے میں شہؑ نے گود میں اصغرؑ کو لا دیا — اور آنکھیں نیچی کر کے یہ بانو سے بس کہا
کوثر سے لے بچہ تیرا سیراب ہو گیا — چپ رہ حصول کچھ نہیں شور و فغاں سے

(۳۲)

لازم ہے یہ بشر کو کہ ہو راضیٔ رضا
بہتر وہ سو ہے حق میں جو ہو مرضیٔ خدا
یہ کہہ کے شاہ عازمِ میدان پھر ہُوا
ہو کر وِداع اپنے سبھی خان و مان[1] سے

(۳۳)

اب بانو کا مَیں رونا رُلانا بیاں کروں؟
یا شاہِ دیں کا رن میں وُہ جانا بیاں کروں؟
یا خیمۂ حرم کا جلانا بیاں کروں؟
یہ ماجرا کہا نہیں جاتا زبان سے

(۳۴)

ہے ہے شہید جب کہ ہوئے حضرتِ امام
غارت گروں نے لُوٹ لیا آ کے گھر تمام
سب کو اسیر کر کے چلے لے بہ سُوئے شام
اک شورِ الاماں تھا زمین آسمان سے

(۳۵)

اہلِ حرم برہنہ سر اونٹوں پہ سب بٹھائے
اور وارثوں کے کاٹ کے سر نیزے پر چڑھائے
یہ کیا سلوک اُمّتِ بے دیں نے ہائے ہائے
پیغمبرِ خدا کے کیا خاندان سے

[1] خاندان - خانماں

(۳۶)

شبرِ خُدا کی ہائے سکینہؑ جو پوتی تھی
کُرتے سے پُونچھ پُونچھ وہ مُنہ اپنا روتی تھی
ایذا یہ دردِ گوش سے بچّے کو ہوتی تھی
اِس ظلم سے اُتارا تھا دُر اُس کے کان سے

(۳۷)

بیمار تھا جو عابدِ رنجور و ناتواں
گردن میں طوق پاؤں میں تھیں اُس کے بیڑیاں
اور اُن ستمگروں کا کروں ظُلم کیا بیاں
جو جو سلوک اُنھوں نے کیے ناتوان سے

(۳۸)

ہلنا محال تھا جسے بستر سے اِک ذرا
وہ اونٹ کھینچتا گیا تا شام پیادہ پا
تلووں سے لوہو جاری تھا لرزہ بدن کو تھا
غافل نہ تھا پر اپنے خُدا کے وہ دھیان سے

(۳۹)

آگے لِکھوں مُصیبتِ اہلِ حرم سو کیا
جو جو کہ اُن پہ راہ میں ظُلم و ستم ہُوا
جرأت نہیں ہے طاقتِ گفتار اب ذرا
چھاتی پھٹے ہے ہائے مری اس بیان سے

(۴۰)

اب التجا یہ سرورِ دیںؐ سے ہے ہر زماں
آنکھوں سے دیکھ روضۂ انور ہوں مدح خواں

بہرِ خُدا مُعاف ہو اے شاہِ دو جہاں
جو معصیت ہُوئی ہو اب اس مدح خوان سے

مرثیہ دیگر

خبر بتولؑ نے جنّت میں جب یہ پائی ہائے کہ کربلا میں سبھی لُٹ گئی کمائی ہائے
تو سر برہنہ وُہ گھبرائی بی بی آئی ہائے اور اُس کو لاش جو بیٹے کی دی دِکھائی ہائے
تو کلکلا کے یہ بیٹھی وُہ سر برائے حُسینؑ
کہ غیب سے لگی آواز آنے ہائے حُسینؑ

حُسینؑ وُہ کہ جو سبطِ نبیؐ ہے ابنِ علیؑ بتولؑ وُہ کہ جو نورِ خدا ہے بنتِ نبیؐ
سو ٹکڑے ٹکڑے جو نعش اُس نے بیٹے کی دیکھی تو لے لے گرد بلائیں یہ کہتی تھی بی بیؑ
کیا یہ کس نے ستم تجھ پہ ہائے میری جان
میں تیرے لاشۂ بے سر کے ہو گئی قربان

بڑے دُکھوں سے مَیں پالا تھا تجھ کو ماں واری سو گھاؤ تیرے بدن پر لگے ہیں یہ کاری

ہر اک زخم سے دریائے خُون ہے جاری کیا یہ اُمّتِ بے دیں نے ظُلم یک باری

رفیق و یار تمام اُس کے بحرِ خُوں میں ڈبائے

وُہ شاہ کشتیٔ دیں کا جو ناخُدا تھا ہائے

حُسینؑ میں تیرے واری یہ کیا ہُوا احوال کہ خاک و خُون میں بے سر پڑا ہے میرے لال

کسی کے دل میں عداوت کا تھا نہ تجھ سے خیال کوئی جو آنکھ دکھاتا نہ تھی یہ اُس کی مجال

سو لوگ پھر گئے یُوں مُصطفٰے کے مرتے ہی

یہ ظُلم تجھ پہ ہُوا مُرتضٰے کے مرتے ہی

تجھے تو دوش پہ احمدؐ نے تھا چڑھایا ہائے سو تجھ کو خاک میں اُس شکل سے مِلایا ہائے

کہ اب تلک نہیں تو نے کفن بھی پایا ہائے یہ ظالموں نے تجھے ظُلم کیوں دکھایا ہائے

نہ سمجھے دِل میں کہ یہ مُصطفٰے کا جانی ہے

نہ جانا تجھ کو کہ حیدر کی یہ نشانی ہے

کوئی غریب بھی دنیا سے گر کرے ہے سفر ‏ ‏ ‏ تو دفن کرتے ہیں اُس کو خدا کے واسطے پر
یہ کیا غضب ہے کہ دونوں جہاں کا تھا سرور ‏ ‏ ‏ اور اب تلک ہے پڑا تیرا لاشۂ بے سر

ہزار حیف کہ دس گز کفن ملا نہ تجھے
کسی نے کھود کے دو گز زمیں رکھا نہ تجھے

نہ لگنے دیتی تھی ہیں تن پہ تیرے گرم ہوا ‏ ‏ ‏ سو خاک و خوں میں تو عریاں بدن ہے ہائے پڑا
کھٹکتے ہوویں گے زخموں میں کنکر اب کیا کیا ‏ ‏ ‏ تصدق اس ترے زخمی بدن کے ہوویں ما

نہ تیری لاش ہے اب تک گڑی مرے جانی
یہ کیسی تجھ پہ مصیبت پڑی مرے جانی

ترا جھولا تا تھا جبریل آکے گہوارا ‏ ‏ ‏ سو یوں تو خاک پہ بے سر پڑا ہے دکھیارا
حسین تو تو رسولِ خدا کا تھا پیارا ‏ ‏ ‏ سو تجھ کو اُمتِ بے دیں نے ہائے یوں مارا

کہ ٹکڑے ٹکڑے بدن خاک و خوں میں رُلتا ہے
ہر ایک زخم سے لوہو پڑا اُبلتا ہے

یہ کیسی کی تری بن کربلا نے مہمانی   کہ تین دن نہ ملا تجھ کو دانہ اور پانی
کھلائی تیغوں کی ان ظالموں نے بُرانی   مجھے تو اب میرے جانی ہے اس پہ حیرانی

نبیؐ وہ آیۂ لولاک جس پہ آئی ہے
نواسہ اُس کا ملا خاک میں دُہائی ہے

یہ زاری کرتی تھی زہراؑ کہ دیکھے کیا یکبار   جُھکائے سر کھڑے روتے ہیں احمدِؐ مختار
اور اُن کے پیچھے ملائک کی ننگے سر ہے قطار   سیاہ کفنیاں پہنے سبھی ہیں ماتم دار

بہا کے آنکھوں سے آنسو کریں ہیں شیون و شین
سبھی کے مُنہ سے نکلتا یہی ہے ہائے حُسینؑ

اُٹھا اُٹھا کے ملائک مَلیں ہیں مُنہ کو خاک   اور اُن کے پاس گریبانِ مصطفےٰؐ ہے چاک
کہے ہے غم میں نواسے کے وُہ شہِ لولاکؐ   یہ کیسا ظلم ہُوا ہائے گردشِ افلاک

ملا نہ پانی ذرا تین دن کے پیاسے کو
سو تشنہ ذبح کیا میرے یوں نواسے کو

سر اپنا پیٹتی دوڑی اُدھر کو زہراؑ ہائے — کہا کہ دیکھو ستم کیا ہوا یہ بابا ہائے
وُہ شاہ دیں کہ تمہارا جو تھا نواسہ ہائے — سو خاک پہ ہے پڑا آج یوں وُہ بے سر ہائے

مَیں دل جلی کہوں کیا یہ تو آشکارا ہے
کہ میرے بیٹے کو ناحق کسی نے مارا ہے

ابھی حسنؑ کا نہ بھولا تھا میرے دل سے غم — ہمیشہ رہتی تھی جنّت میں مَیں بدیدہ غم
ہوا حسینؑ کے مرنے سے اور الم پہ الم — ازل سے کیا مری قسمت میں تھا لکھا ماتم

کہ جب تلک رہی دُنیا میں غم رہا گھیرے
گئی جناں کو تو مارا حسینؑ کو میرے

کہا نبیؐ نے خدا تجھ کو صبر دے زہراؑ — یہ غم سبھوں پہ ہے بیٹی الم جو تجھ پہ ہوا
دیا حسینؑ کو دُکھ جس نے اُس نے مجھ کو دیا — تو بس عدو جو مرا ہے وُہ ہے عدوئے خدا

یہ کلکلاتی ہے اِس شکل وُہ برُوئے زمیں
مجھے ہے خوف مبادا گرے یہ عرش کہیں

تو بولی حضرتِ زہرا غضب ہوا بابا　　مرے حسینؑ کی صورت تو آ کے دیکھو ذرا
کہ خاک و خوں میں کیسا پڑا ہے بے سر پا　　نہیں ہے تن پہ تو اس کے وہ چاند سا مکھڑا

کہ میں کسی کو جسے دیکھنے نہ دیتی تھی
لٹا کے گود میں اپنی بلائیں لیتی تھی

نظر لگے نہ کسی کی رہے تھا مجھ کو یہ ڈر　　کیا میں کرتی تھی اسپند اس کو آٹھ پہر
جب آگے آتا تھا میرے مرا یہ نورِ بصر　　تو دیکھ لیتی تھی ایڑی لگے نہ تا کہ نظر

سو شکل بھی نہیں مجھ کو نظر وہ آتی ہائے
ترستی ہیں مری آنکھیں پھٹے ہے چھاتی ہائے

حسینؑ پیارے پہ آفت یہ کیسی ہائے پڑی　　نہیں ہے لاشۂ بے سر پہ ایک چادر بھی
خدائی ہے کہ جسے دیکھتے ہر ایک گھڑی　　نظر گزر کے لیے کالا دانہ کرتی تھی

سو اب وہ خاک پہ بے جان پڑا ہے وہ فرزند
نہیں ہے کوئی کہ بیٹھا جلائے یاں اسپند

۱ بولیں　۲ اس پہ　۳ وہ

غرض ہے مرنے کی جا اب سنو محبو آہ یہ بین سن کے جو آگے بڑھے رسول اللہ
پڑی نواسے کے لاشے پہ جو نبیؐ کی نگاہ تو کھینچی آہ کلیجے سے یوں بہ حالِ تباہ
اگر لکھوں تو قلم کی زبان جل جاوے
کروں بیان تو سارا جہان جل جاوے

نبیؐ پہ کیا کہوں جیسی الم کی شدت تھی بتولؑ بی بی کی پوچھو نہ جو کہ حالت تھی
غرض شہیدوں کے مقتل پہ اک قیامت تھی حسینؑ کے لیے سب دلوں کی یہ صورت تھی
اِدھر تو فاطمہؑ سر پیٹ پیٹ روتی تھی
اُدھر رسولؐ کی حالت تباہ ہوتی تھی

اور اتنی فوج ملائک جو اُن کے تھی ہمراہ وہ سینہ پیٹتے تھے پہنے سب لباسِ سیاہ
عجب طرح کی تھی برپا قیامت اُس دم آہ تمام حور و ملک ہمرہ رسول اللہ
سر اپنا پیٹ کے روتے تھے جب برائے حسینؑ
یہی صدا تھی کہ ہے ہے حسینؑ ہائے حسینؑ

بیان کرے ہے یہ راوی اب اس روایت کا کہ آئے نعش مبارک پہ جب رسولؐ اللہ
اور اُن کے ساتھ تھیں گریان حضرت زہراؑ تو معجزے سے وہیں لاشۂ حسینؑ اُٹھا

کہا معاف ہو بے دست و پا ہے اب یہ امام
اُسے ادب سے یہ کرتا وگرنہ جھک کے سلام

لگایا فاطمہؑ نے دوڑ کے کلیجے سے کہا کہ گزری یہ کیا تجھ پر اے حسینؑ مرے
بیان کچھ تو کر احوال میں تیرے صدقے یہ دست و پا ترے اے لال کس نے ٹکڑے کیے

نہ جانا تجھ کو کہ یہ تین دن کا پیاسا ہے
نہ سمجھے اتنا کہ احمدؐ کا یہ نواسا ہے

تو سن کے حضرت شبیرؑ نے یہ فرمایا جو کچھ کہ وعدۂ حق تھا سو میں بجا لایا
ہزار شکر کہ راہِ خدا میں کام آیا سر اپنا دے کے میں اُمت کا جرم بخشایا

ادائے شکر نہ ہو اُس کا گر زباں ہو ہزار
رہیں گے حشر تلک لوگ میرے ماتم دار

اور اب جو پوچھو ہو تم کربلا کے آنے کی
تو شرح کیا میں کروں اس ستم اٹھانے کی
حقیقت اب کہوں اکبرؑ کے جی سے جانے کی
کہ ہائے اصغرِ ناداں کے سر کٹانے کی

وُہ دیکھو چھاتی پہ بھالا جو کھا کے لیٹا ہے
تمہارا پوتا ہے اکبرؑ یہ میرا بیٹا ہے

ابھی جوانی کا کیا اُس نے دیکھا اماں جان
اُٹھا جہان سے حسرت بھرا یہ پُر ارمان
جسے نہ آنکھوں سے کرتا تھا میں جدا اِک آن
سو دیکھو خاک پہ کیسا پڑا ہے اب بے جان

کوئی نہیں جو کرے اس کی اب نگہبانی
پڑا ہے خاک پہ بے جان کیسا مرا جانی

وہ دیکھو چھوٹا سا لاشہ جو یہ پڑا ہے یہاں
سو اماں جان یہ میرا ہے اصغرِ نادان
ابھی کھلی بھی نہ تھی جس بچے کی ہائے زباں
سو اُس کے ننھے سے حلقوم پر لگا پیکان

یہ شرمگیں مجھے بانو سے کر گیا ہے یہ
تڑپ کے ہاتھوں پہ میرے جو مر گیا ہے یہ

یہ کہہ کے بانو سے لایا تھا اس کو میں شبّیر
کہ یہ صغیر ہے دیں گے مُقرّر اس کو شیر

سو ظالموں نے عوض شیر کے لگا کے تیر
کہ چھوٹے زخم سے حلقوم کے لہو کے نیر

جو دیکھا بانو نے حلق اُس کے میں لغارا ہے

سر اپنا چوب سے اُس دل جلی نے مارا ہے

وہ دیکھو بر میں شہانا ہے جس کے پیراہن
سو ہائے قاسم نوشہ پڑا ہے ابنِ حسن

کٹی ہیں سہرے کی لڑیاں ہوا ہے ٹکڑے بدن
تمام خوں سے گریبان تر ہے تا دامن

بنے کی کیا ہوئی حالت بنا تھا یوں کر شاہ

کہ جیسے خواب میں دیکھے ہے کوئی اپنا بیاہ

بنی پہ بنتی ہے بڑا جو ہووے تیغ زنی
تو جی پہ آن بنے اور بنی سو رانڈ ہوئی

ہزار حیف کہ نوشہ بنے کی گُل بدنی
تمام خار جفا سے بروز عقد چھنی

چڑھایا نیزے پہ سہرا بندھا سر اُس کا ہائے

کٹی کلائی وہ جس میں بندھا تھا کنگنا ہائے

وہ دیکھو لاشیں جو یک جا ہیں خاک میں بے سر　　یہ ہیں گے اماں میرے بھانجے بہن کے پسر
میں کیا کہوں کہ ہوئے کس طرح فدا مجھ پر　　نہ مانی بات زبس تھی شجاعتِ حیدر
پڑے ہیں خاک پہ کھا تیغ و تیر و بھالا ہائے
نہیں ہے کوئی گڑا دینے والا اُن کا ہائے
کہوں میں اپنی یہ زینب بہن کی شفقت کیا　　کہ میرے آگے نہ بیٹوں کے تئیں عزیز کیا
کہا حسینؑ پہ جلدی ہو جان و دل سے فدا　　کہ تم تو میرے ہو بیٹے یہ بی بی زہراؑ کا
سو ہائے ایسی بہن ہو گئی ہے میری اسیر
پڑا ہوں اُس سے جدا سر کٹا کے میں شبیرؑ
وہ دیکھو سوکھی سی مشک اک پڑی ہے جس کے پاس　　یہ بھائی جان علمدار تھا مرا عباسؑ
ہوئی سکینہ کی اُس کو نہ جب گوارا پیاس　　تو اپنے جی سے گیا ہو کے زندگی سے اُداس
جدا ہیں شانے بدن ٹکڑے خاک پر ہے پڑا
کٹا جو سر تو علمدار کا علم یہ چڑھا

مُجھے بھی جینے سے اُس کے رہی تھی نہ آس ہائے — مُوا جو بھائی مرا، مَیں ہوا بھی بیکس ہائے

کیا بس اُس کی شہادت نے مجھ کو بیکس ہائے — یہ جی میں آیا کہ جاں اپنی دیجے بس ہائے

سپاہِ غم مرے آ ملکِ دل کو لوٹ گئی

دم اُس کا ٹوٹتے ہی کچھ کمر سی ٹوٹ گئی

پھر اور جو ہیں پڑے گردِ لاشۂ بے سر — سبھی رفیق و عزیز اور مرے ہیں لختِ جگر

مَیں کیا کہوں کہ ہُوا آں جان کیا مجھ پر — بغیر شکرِ خدا مَیں نے کچھ کیا نہ مگر

اگرچہ قاتلوں نے سب کو ہے ستم مارا

سوائے حرفِ رضا، پر نہ مَیں نے دم مارا

کہاں زباں جو ہو مجھ سے ادائے شکرِ خدا — کہ سر کٹا مرے تن سے تو سجدہ میں رکھا

جو کچھ کہ مرضیِ حق تھی مَیں راضی اُس پہ رہا — یہی ہے بندے کو لازم کہ ہو خدا پہ فدا

وہ اِس عنایتِ حق سے نہ کیوں خوشی ہووے

کہ رووے جو مرے غم میں سو جنّتی ہووے

بس اماں جان مرا التماس ہو یہ قبول   خدا کے واسطے تم اس قدر تو ہو نہ ملول
تمہارے رونے سے ہیں غمزدہ جناب رسولؐ   نہ پیٹو سینہ تم اپنا اُڑاؤ سر پہ نہ دھول
ہمارے لاشے برہنہ یاں یہ دفن ہوئیں گے
جو ہیں محب ہمیں محشر تلک وہ روویں گے

یہ سن کے حرف رضا بولیں حضرت زہرا   ہزار جان سے اپنی میں ہوں گی تجھ پہ فدا
کہ میرے بابا کی اُمت کو تو نے بخشایا   کہا رسول خدا نے بھی یوں گلے سے لگا
خدا کے آگے دلا دی ہے سرخروئی مجھے
کٹا کے اپنا گلا آفریں حسین تجھے

اب آگے زاری زہرا میں کیا کہوں جرأت   کہ کہنے کا مجھے یارا نہیں رہا جرأت
کلیجہ منہ کو چلا آئے ہے مرا جرأت   قلق انھوں کے قیامت دلوں کو تھا جرأت
کہ اپنے لال کے لاشے کو کر سپرد خدا
گئے جو خلد بریں کو رسول اور زہرا

لکھوں اب اور میں کیا واردات اہلِ حرم　　قلم کی پھٹ گئی چھاتی رقم ہو کیونکہ یہ غم

یہ اُن کی خدمتِ عالی میں عرض ہے ہر دم　　سوائے دردِ حسینؑ اور ہو نہ مجھ کو الم

اِسی الم میں سدا روؤں اور رُلاؤں میں

بصارت آنکھوں کی پا، کربلا کو جاؤں میں

○

سلام

کہو رو رو سلام اُس کو کہ جو مارا پڑا رن میں
ہر اک لختِ جگر جس شاہ کا ٹکڑے ہوا رن میں
سلام اُس زورقِ بحرِ ولایت پر کہو جس پہ
غم و اندوہ و رنج و درد کا طوفاں اُٹھا رن میں
سلام اُس پر کہ کُنبہ جس کا سب مارا پڑا ہے ہے
اور آئی کربلا میں اُس پہ کیا کیا کچھ بلا رن میں

سلام اس پر کہ جو لوہو کے دریا میں ہوا غرق آہ
نہ کوئی تھا شفیق اس دم نہ کوئی آشنا رن میں
سلام اس پہ کہ جس کی لاش پہ یوں آ کے زہرا نے
بلائیں لے کے اپنے لال کی رو رو کہا رن میں
ترے قربان جاؤں لال کیوں بے سر پڑا ہے تو
یہ حال داری تجھے کس نے کیا ہے دست پا رن میں
ہوا اے سرورِ دیں کیا وہ تختِ سلطنت تیرا
پڑا ہے خاک پر تو کیوں امیر و سرا رن میں
اکیلا تجھ کو دشمن نے میں نہ دیتی تھی سو اب ہے ہے
اندھیری رات میں ہے خاک پر تو لوٹتا رن میں
گلوئے نازپرور پہ یہ پھیرا کس نے خنجر کو
کوئی کاش اس کے بدلے کاٹتا میرا گلا رن میں

تجھے ترسا کے مارا بوند بھر پانی کو اور ہے ہے

لہو سے تیرے کیوں اے لال دریا بہ چلا رن میں

جو دیکھا اقربا کو تیرے اور تیرے رفیقوں کو

پڑے ہیں پیش و پس اِدھر اُدھر سب کشتا رن میں

چلے ہیں پیاسے اور میرے بہے ہیں اشک آنکھوں سے

دِکھایا مُجھ کو قسمت نے یہ کیسا ماجرا رن میں

اب آ گئے حضرت زہراؑ کی زاری کیا کہے ثابت

کہ اُس بی بی نے کس کس شکل سے ماتم کیا رن میں

○

مہندی

ہائے تقدیر نے یہ کیسی دکھائی مہندی
لوہو سے ابن حسنؑ نے جو رچائی مہندی

مرگ نے کر کے سلام اُس کو لگائی مہندی
ساتھ لوہو سے براتی بھرے لائے مہندی

بنے قاسمؑ کی عجب رنگ سے آئی مہندی

بیٹھی ہیں سینہ سپر سمدھنیں کھڑیاں ہیں ہے
ہے کہاں عطر کہاں پھولوں کی چھڑیاں ہیں ہے

جو براتی ہوئے لاشیں نہیں گڑیاں ہیں ہے
بُوندیں سب لوہو کی کپڑوں پہ پڑیاں ہیں ہے

بنے قاسم کی عجب رنگ سے آئی مہندی

شمعیں روشن ہیں وہاں دل جو ہیں سب کے سوزاں
اور شہنائی کی حالت پہ ہے فریاد وفغاں

زخم ہر ایک کے تن پہ عوض گل ہے عیاں
سب ملک کہتے فلک پہ ہیں یہ افسوس کناں

بنے قاسم کی عجب رنگ سے آئی مہندی

لاتے ہیں کھاٹ کھٹولوں پہ جو لاشوں کو دھرے — وادریغا سو وُہی تخت ہیں آرائش کے
جب بنی کہتی کہ کیا تجھ پہ یہی ہار ہے بنے — لال لوہو سے رنگا جوڑا ہے دُولھا کے گلے

بنے قاسمؑ کی عجب رنگ سے آئی مہندی

نُقل و شربت کو ہو پھر کیونکہ نہ واں حیرانی — تین دن ہیں کہ جہاں بند ہوا دانہ پانی
اشک خونی کی ہر اک چشم سے ہے طغیانی — ہر براتی کی لہو سے ہے بھری پیشانی

بنے قاسمؑ کی عجب رنگ سے آئی مہندی

چاہ دُولھا کو جو تھا رہ گیا من ہی میں من کا — اور سر زانوئے غم سے نہ اُٹھا دُولھن کا
پیاس سے خشک دہن ہوئے تو ہر سمدھن کا — چشم پُر خوں ہے [اپنے شیون کا

بنے قاسمؑ کی عجب رنگ سے آئی مہندی

آہ سینے سے ہر اک کھینچے ہے یُوں آتش بار — چھوٹتے خانۂ شادی میں ہیں جیسے کہ انار
لوگ جو آئے ہیں ہمراہ سو ہیں ماتم دار — زخمیوں کی چلی آتی ہے پس و پیش قطار

بنے قاسمؑ کی عجب رنگ سے آئی مہندی

دیکھے ہے رو رو کے شکل اس بچی کی اماں جان
نیگ لینے کو جو بیٹھی ہے سکینہ نادان
اور پڑتی ہے نظر جس پہ سو ہے لوہو لہان
سر پہ دھر اپنے تھما موت کے لائی ہے خوان

بنے قاسمؑ کی عجب رنگ سے آئی مہندی

کہ رنڈاپے کا پیام اُس کو بس آیا ہے ہے
ابھی جوڑا نہیں دُلہن کو پہنایا ہے ہے
بانو سر پیٹ کے کہتی ہے خدایا ہے ہے
یہ قضا نے جو اُسے رنگ دکھایا ہے ہے

بنے قاسمؑ کی عجب رنگ سے آئی مہندی

پیاس سے چاٹتے ہیں ہونٹوں کو معصوم اے وائے
گھر میں شادی ہے کہ ماتم نہیں معلوم اے وائے
خاک اُڑا کر کہیں ہیں زینبؑ و کلثومؑ اے وائے
چار سو خیمے کے خونریزی ہے اور دھوم اے وائے

بنے قاسمؑ کی عجب رنگ سے آئی مہندی

کیا حنا بندی قاسمؑ کا کروں اور بیاں
آگے جرأت مجھے کہنے کا نہیں تاب و تواں
ہاتھ مل مل کے سبھی کہتے ہیں یہ خورد و کلاں
صورت رنگ ہوا خون کا دریا تھا رواں

بنے قاسمؑ کی عجب رنگ سے آئی مہندی

عرض یہ قاسمؔ نوشہ کی ہے خدمت میں مدام — نورِ چشمِ حسن[۱۴] اب پائے بصارت یہ غلام

اور کونین میں مقبول مرا ہوئے کلام — رٹے اس مصرعہ جاں سوز کو سن خلق تمام

بنے قاسمؔ کی عجب رنگ سے آئی مہندی

سلام

(١)

جا رَن میں شہِ دیں نے گردن جو ہے کٹوائی کٹوائی جو گردن تو زینبؑ بھی وہاں آئی
آئی تو یہ کہتی وہ لاشے کے کنے آئی آئی ہے بہن تیری مجرے کے لئے بھائی

(٢)

بھائی ہیں ترے صدقے کیوں رَن میں ہے تو بے سر سر تن پہ نہیں تیرے اور ٹکڑے ہے سب پیکر
پیکر ہے ترا عُریاں اُس پر نہیں اک چادر چادر بھی کسی نے لا اک تجھ کو نہ اُڑھوائی

(٣)

اُڑھوائی نہیں چادر تو خاک میں رُلتا ہے رُلتا ہے بدن تیرا اور دُھوپ میں جلتا ہے
جلتا ہے تو اور لہو ہر زخم سے ڈھلتا ہے ڈھلتا ہے لہو اب جوں اک سیل سی ہو آئی

(٤)

آئی جو میں رَن میں تو دیکھی تیری یہ حالت حالت ہے عجب تیری کیا ہو گئی یہ صورت
صُورت بھی نہیں دیکھی پھوٹی یہ میری قسمت قسمت نے مجھے ہے ہے کیا شکل دکھلائی

(۵)

دکھلائی نہیں دیتا وہ چاند سا مکھڑا جو — جو دل پہ گزرتی ہے میں کس سے کہوں رو رو
رونے بھی نہیں دیتی دل کھول کے اب مجھ کو — کوئی نہیں اب وارث کس سے کہوں تنہائی

(۶)

تنہائی کا غم تجھ بن کس سے میں کہوں جا کر — کربل میں گئے مرے غمخوار جب تجھے یکسر
سر مجھ کو نظر آیا نہیں ایک بھی تن پر — پردیس میں گئی لوٹی میں فاطمہ کی جائی

(۷)

جائی ہوں میں زہرا کی پر ہائے کہوں کس سے — کس سے کہوں یہ میری کوئی داد کو یاں پہنچے
پہنچے سبھی جنت کو غمخوار جو تھے میرے — میرے نہیں جینے کی امید بھی اب بھائی

(۸)

بھائی نہ مجھے اپنی بھی زیست ترے بن اب — اب کاش نکل جاوے جی تن سے یہ ہے مطلب
لب پر ہے مرے فریاد اور دل میں ہے تاب و تب — تب چین ہو جب دیوے صورت تو ہی دکھلائی

(۹)

لائی مجھے قسمت کہیں اس دشت میں واویلا
لاتے ہی جو یاں میرے سب کنبے کو کٹوایا
یارب میں کہوں کس سے جو کچھ کہ ستم دیکھا
کھانے کی نہ پانی کی اک شکل نظر آئی

(۱۰)

ہے ہے مرے پیاروں کو اب آئی ہے موت اس جا
جاتے ہی ہر اک رن میں بس جان سے ہی گذرا
راہی ہوئے جنت کو سب رہ گئی میں دکھیا
یارب مری کشتی کیوں اس چرخ نے ڈبوائی

(۱۱)

ڈلوائی مری کشتی طوفانِ حوادث لا
لاکھوں ہی طرح کا یاں دکھ دل کو مرے پہنچا
چارا نہیں کچھ اس کا حیران ہوں واویلا
لاچار ادھر اُدھر دیکھوں ہوں بن میں گھبرائی

(۱۲)

گھبرائی ہوئی زینب کہتی تھی یہ رو رو کر
کر سکتا ہے کون اُس کی حالت کو رقم یکسر
سر زانو سے جرأت کا اُٹھتا نہیں اب اوپر
یہ دیکھیوں کی اُس کو حالت جو وہ یاد آئی

سلام

ہائے تقدیر جو شبّیر کو لائی رَن میں
آتے ہی اُس کے قضا مُجرے کو آئی رَن میں

جس کی آنکھوں نے نہ کچھ غیرِ خُدا دیکھا تھا
کیا صعُوبت اُسے اُمّت نے دِکھائی رَن میں

دوشِ احمد پہ جسے دیکھتے تھے عید کو لوگ
چاند سی شکل وُہ نیزے پہ چڑھائی رَن میں

جو کہ تھا آتشِ دوزخ کا بجھانے والا،
مَرتے مَرتے بھی نہ پیاس اُس کی بُجھائی رَن میں

جس نے اُمّت کے لیے ایسی اُٹھائی ایذا
لاش بھی اُس کی کسی نے نہ اُٹھائی رَن میں
روزِ محشر ہے جو کوثر کا لُٹانے والا،
لُٹ گئی ہائے ستم اُس کی کمائی رَن میں
جس کے ہاتھ اُٹھتے تھے اُمّت کے لیے بہرِ دُعا
کردی پہنچے سے جُدا اُس کی کلائی رَن میں
جس نے بہنے نہ دِیا کشتیٔ اُمّید کے تئیں
اُس کے لوہُو کی ندی ہائے بہائی رَن میں
محوِ دیدار تھا نقّاشِ ازل بھی جس کا
کُوفیوں نے سو وُہ تصویر مِٹائی رَن میں
بوتُراب آنکھوں سے کرتے تھے نہ ٹُک جس کو جُدا
خاک میں چاند سی صُورت وُہ مِلائی رَن میں

حُلّۂ نُور سے ہے جس کے بدن کی پوشش
اُس کو چادر بھی کسی نے نہ اُڑھائی رَن میں

جو کہ ہو سبطِ نبیؐ ساقئ کوثر کا پسر
اُس کے بچّوں کو ہو پانی کی منائی رَن میں

ہائے تھا احمدِ ثانی جو وُہ اکبرؑ پیارا
وُہ محمّدؐ کی نشانی بھی مٹائی رَن میں

ہائے اصغرؑ جو کئی دن کا تھا بُھوکا بیتاب
تیر کی بھال گلے اپنے پہ کھائی رَن میں

خُشک حلقُوم ہُوا لوہُو سے تر بچّے کا
بُوند پانی کی دمِ مرگ نہ پائی رَن میں

○

بانو کہتی تھی کہ آ چھاتی سے لگ جا پیارے
آئی ہے دُودھ پلانے تری دائی رَن میں
ہائے وُہ شاہ کا بھائی جو اُٹھاتا تھا عَلَم
اُس کی شبّیر نے ہے لاش اُٹھائی رَن میں
ہائے وُہ قاسمِ نوشہ جو نواں بیاہا تھا
جس نے مہندی لہُو اپنے سے لگائی رَن میں
پیرہن تھا جو شہانا سو کفن اُس کا تھا
شکل اُس بیاہے کی زیبائی بنائی رَن میں
ایک شب بھی نہ دُلھن ساتھ گئی ڈولھا کے
چرخ نے ساری برات آپ کٹائی رَن میں
جا کے بنڑے کی سواری نہ پھر آئی اور ہائے
وُہ نول بیاہی اُسے پیٹنے آئی رَن میں

دیکھ لو ہو سے بھری اپنے بنے کی صُورت

بیٹھی دیتی تھی محمّدؐ کی دُہائی رَن میں

اِک طرف کہتی یہ زینبؑ تھی کہ ہے ہے بھائی

تیری صُورت بھی نہیں دیتی دکھائی رَن میں

اب تلک تو یہ میں کہ کہ کے سکینہ کو رکھا

چھوڑ واں جو اُسے مَیں آئی تھی بھائی رَن میں

بی بی صدقے ترے مت رو کہ ترے بابا نے

گھر میں آنے کو سواری ہے منگائی رَن میں

اب دلاسا اُسے کس بات سے دُوں گی ہے ہے

یہ بھی روتی جو مرے ساتھ ہے آئی رَن میں

الغرض اہلِ حرم نے جو وُہ لاشیں دیکھیں

تو قیامت کی سی اک دھوم مچائی رَن میں

آگے بس کیا کہے جرأت نہیں یارائے سُخن
بھر گئی نُورِ خُدا کے سے خُدائی رن میں

مانگے اُس شمعِ ولایت سے ہے یہ نُورِ نظر
روشنی [مہر کی تھی] جس نے بڑھائی رن میں

○

کہ سلام اُس پر جو ہے شاہِ حسنؑ، شاہ حسینؑ

کہتی ہے ارض و سما ہائے حسنؑ آہ حسینؑ

یوں رضا پر رہے راضی کہ خدا نے اُن کو

ہو کے خوشنود کہا واہ حسنؑ واہ حسینؑ

نور سے اُن کے ہے روشن فلکِ دین اب تک

بُرجِ ایمان کا ہے مہر حسنؑ ماہ حسینؑ

سرورِ مُلکِ ولایت ہے علیؑ شیرِ خدا

اور اُس شاہ کی حشمت ہے حسنؑ جاہ حسینؑ

یوں مَلک ماتمِ حسنینؑ میں رہتے ہیں مُدام

گاہ سر پیٹ کے کہتے ہیں حسنؑ، گاہ حسینؑ

رہروانِ رہِ دیں [پہنچیں نہ منزل کو] کبھی

گر نہ پاویں یہ ہنا اُن کو حسنؑ راہ حُسینؑ

آج تک عاشق خالق نہ کوئی ایسا ہُوا

حُسینؑ ----------------

فی الحقیقت تو وُہ دو ایک تجلّی کے ہیں نُور

ہاں مجازاً کہو تُم خواہ حسنؑ، خواہ حُسینؑ

جلد اب جُرأتِ مدّاح کی آنکھوں میں اب

روشنی دیجئے اے شاہ حسنؑ، شاہ حُسینؑ

○

کرے سلام نہ از خود جو اُس اِمامؑ کو ہاتھ
تو پُشتِ خار کے مانند ہے وہ نام کو ہاتھ

غمِ حُسینؑ میں جو اشکِ چشم پُونچھے گا
لگے گا حشر میں کوثر کے وُہ ہی جام کو ہاتھ

کرے ہے چشمِ فلک سُرمہ خاکِ پا اُس کی
ادب سے جس کا لگے گنبدِ امامؑ کو ہاتھ

نہ سر پہ ہاتھ رکھو پھر ...... اہلِ جہاں
دیا ہے حق نے یہ شبیرؑ کے سلام کو ہاتھ

سلامؔ اُس کا نہ تھا گر سلام کو منظور

تو کیوں سلام نے بخشا ہے ہر کُدام کو ہاتھ

مُدام چاہیے یوں ماتمِ حُسینؑ کریں،

نہ صُبح سینے سے ہووے جُدا نہ شام کو ہاتھ

قطعہ

اگر یہ پُوچھے کوئی ہم سے آن کر یہ بات

یہ سر ہے کس لیے اور کون سے ہے کام کو ہاتھ

تو اُس سے کہیے کہ سُن اُس امامؑ کے در پر

یہ بہرِ سجدہ ہے سر اور ہے سلام کو ہاتھ

کہوں میں تیز روی اُس کے ذوالجناح کی کیا

لگے ہوا کا نہ زنہار جس کے گام کو ہاتھ

وہ پہنچے بس وہیں رُوئے زمین سے تا عرش
جو را کب اُس کے کا لگ جائے ٹک لگام کو ہاتھ

بچشمِ جرأتِ مدّاح روشنی دو شاہ
لگا دو مہر سے ٹک دیدۂ غلام کو ہاتھ

○

○

سدا کہیے سلامِ شہ بھلا تو اس سے کیا بہتر
اگر توفیق دے ایسی خدا تو اس سے کیا بہتر
وُہی شبیرؑ نورِ حق کہا یوں جس نے مرتے دم
جو ہم نے راہِ حق میں سر دیا تو اس سے کیا بہتر
بھلا عشاق میں تو سرخروئی دی ہمیں حق نے
لہو اپنے محاسن پر ملا تو اس سے کیا بہتر

کیا حق نے عنایت مرتبہ تسلیم کا ہم کو
گلا تیغِ رضا سے کٹ گیا تو اس سے کیا بہتر

ملے گا گھر ہمارے نانا کی اُمّت کو جنّت ہیں
گھر اپنا اس میں گو ویراں ہُوا تو اس سے کیا بہتر

بھلا راہِ رضا سے تو نہ ہم نے اپنا مُنہ موڑا
یہ اس رستے میں گھر کا گھر لُٹا تو اس سے کیا بہتر

بھلا غوّاص تو کہلائے ہم بحرِ شہادت کے
جہاز اس جانب ہی میں پڑا تو اس سے کیا بہتر

جو بچّے بلبلا کر مر گئے تو مر گئے اچّھا
رضا پر کٹ گئے سب اقربا تو اس سے کیا بہتر

جو رُتبہ ہے عبُودیّت کا اُس کو یہ بھی لازم ہے
خُدا پر گر ہُوئے ہم سب فدا تو اس سے کیا بہتر

تو بس ایسا ہو جو عاشق خدا کا اس شہِ دیں کی
اگر کہیے سدا مدح و ثنا تو اِس سے کیا بہتر
یہ اُس سے عرضِ جرأت ہے کہ اس مدّاح کو اپنے
بصارت دو تم آنکھوں میں شہا تو اس سے کیا بہتر

جرأت کے یہ مراثی و سلام اردو مرثیے کی روایت میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسے شاعر کی تخلیق ہیں جو زندگی بھر حسن و عشق کے اسرار و رموز کو بے نقاب کرتا رہا لیکن جس کا دل عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کی محبت سے سرشار تھا۔ اسی لئے ان مراثی و سلام میں صداقت اور جذبۂ خلوص نے دردمندی اور گداز کی وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جو اس قسم کی شاعری کی جان ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی